Presented by. Dr.Shahab Zafar Azmi,Associate Professor

Department of Urdu Patna University.Patna

Mob;8863968168 Email;drshahabzafar.azmi@gmail.com

دوگز زمین اور عبدالصمد کی ناول نگاری

عبدالصمد کا شمار اس عہد کے ممتاز فکشن لکھنے والوں میں ہوتا ہے۔ وہ ناول اور افسانہ دونوں میں یکساں فنی مہارت رکھتے ہیں۔ ''دوگز زمین'' (۱۹۸۸) ''مہاتما'' (۱۹۹۲) ''خوابوں کا سویرا'' (۱۹۹۴) ''مہاساگر'' (۱۹۹۹) اور ''دھمک'' (۲۰۰۴) ان کے پانچ مشہور ناول ہیں جن میں ''دوگز زمین'' کو ۱۹۹۰ء میں ساہتیہ اکادمی انعام سے نوازا گیا۔ مہاتما تعلیم جیسے اہم اور نازک موضوع پر خوب صورت ناول ہونے کے باوجود بہت زیادہ شہرت حاصل نہ کرسکا۔ دوگز زمین اور خوابوں کا سویرا اپنے موضوع کے ساتھ ساتھ خوبصورت اسلوب کی وجہ سے موضوع بحث بنے رہے۔ یہ دونوں ناول چوں کہ باترسیل اسلوب نگارش اور طریق کار کے جملہ اوصاف لئے ہوئے ہیں اس لئے ہر لحاظ سے لائق مطالعہ ہیں۔ ان میں جہاں ناول کا جانا پہچانا دروبست موجود ہے وہاں امکانی جہتوں کے اشارے بھی سرگوشیانہ انداز میں محوتکلم ہیں۔ کردار، واقعہ، مکالمہ، تصویرکشی، غیرگنجلک بیانیہ، ان سب کی مدد سے عبدالصمد نے ایسے عصری مسائل اور انسانی صورت حال کے ایسے عصری تضادات کی تخلیقی تجسیم کرنے کی کوشش کی ہے جو عہد حاضر میں ہم سب کے لئے تشویش کا باعث بنتے جارہے ہیں۔ ہندوستانی معاشرے میں بعض مسائل ایسے ہیں جن کا تعلق مختلف فرقوں کی یک جہتی یا باہمی کشمکش اور اقدار کے نروان اور بحران سے ہے۔ عبدالصمد نے اپنے ناولوں میں تہذیبی زوال اور اقدار کے بحران کا منظرنامہ پیش کیا ہے ''دوگز زمین'' میں ناگزیریت کے المناک احساس کے ساتھ اور ''خوابوں کا سویرا'' میں امکانی اشاروں کی زبان اختیار کرکے۔

''دوگز زمین'' (۱۹۸۸) کا آغاز تحریک خلافت سے ہوتا ہے اور اختتام قیام بنگلہ دیش پر، اس لئے ناول میں تقسیم وطن کے نتیجے میں تقسیم کنبہ کا کرب والم جابجا جھلکتا ہے۔ اصغر حسین مغربی پاکستان میں مہاجر ہیں اور اختر حسین اپنے آبائی وطن ہندوستان کو ترک کرنا نہیں چاہتے لیکن مالی بدحالی سے پریشان ہوکر ''گردنیا'' پاسپورٹ کے سہارے مشرقی پاکستان میں داخل ہوجاتے ہیں۔ وہاں انہیں ملازمت بھی مل جاتی ہے لیکن قیام بنگلہ دیش کے بعد بہاری ہونے کے جرم میں ہندوستان واپس لوٹنا پڑتا ہے۔ اختر حسین کو ہندوستان میں ایک اور مسئلہ کا سامنا کرنا پڑتا ہے ان کے گھر میں ان کے پاکستانی اعزہ واحباب کے خطوط آتے رہتے ہیں جن کو بنیاد بنا کر ان پر الزام لگتا ہے کہ ان کے گھر میں ٹرانسمیٹر کے ذریعے پاکستان کو خفیہ خبریں پہنچائی جاتی ہیں حالانکہ اس کے برعکس اختر حسین کا رویہ یہ ہے کہ بنگلہ دیش کی

خبریں پاکستان ریڈیو کے ذریعے سننا پسند نہیں کرتے۔ ان کے گھر کی تلاشی سی بی آئی لیتی ہے۔ اس مسئلے کے تجزیے میں عبدالصمد نے حقیقت نگاری کے جوہر دکھائے ہیں اور سیاست کی دوہری شاطرانہ چال کو بے نقاب کیا ہے کہ ایک طرف تو سیکولرزم ہونے کی دعویداری ہے اور دوسری جانب قوم پرور مسلمانوں کو شک وشبہے کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے۔ اختر حسین اپنے بیٹے حامد کو پناہ دے سکتے تھے لیکن ان کی اصول پرستی اور وطن دوستی انہیں بیٹے کو پناہ دینے سے روکتی ہے حالانکہ وہ جانتے ہیں ڈھاکے کے حالات حامد کے لئے درست نہیں ہیں۔

عبدالصمد نے آزادی سے چند برس قبل سے لے کر تقریباً پچیس تیس برس بعد تک کی سیاست کا جیسا مربوط مسلسل اور موثر بیان ''دوگز زمین'' میں پیش کیا ہے وہ لاجواب ہے۔ کانگریس اور مسلم لیگ کی تلخ نوا سیاست، فرقہ وارانہ فسادات کے نتیجے میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے ووٹ کا Polarisation اور اسکے نتائج، ملک کی آزادی اور اس کے بعد آزاد ہندوستان کے سیکولر لیڈروں کی بدمستی، نیشنلسٹ مسلمانوں کی ناقدری، زمینداری کا خاتمہ اور اس کے نتیجے میں مسلمانوں کی مالی بدحالی، سیاسی رہنماؤں کی مفاد پرست سیاست اور لوٹ کھسوٹ کے سبب روز افزوں بے روزگاری، اس کے سبب مسلمانوں کی مشرقی یا مغربی پاکستان کی طرف ہجرت، پھر بنگلہ دیش کا قیام اور قتل وغارت گری، ہندوستان میں ایمرجنسی کا نفاذ اور کانگریس کی شکست، پاکستان میں مہاجرین کی درگت اور تلاش رزق میں عرب ممالک کی طرف روانگی یہ وہ بنیادی موضوعات ہیں جو اس ناول کا تانا بانا تیار کرتے ہیں اور بالکل صاف ستھرے اور سچے طریقے سے اس طرح سامنے آتے ہیں کہ ان میں خیال آفرینی کا شبہ بھی نہیں ہوتا۔ یہ سارے احوال واقعات کی کڑیوں سے لپٹ کر بڑے فطری انداز میں پیش ہوئے ہیں جیسے ازخود کوئی پودا نمو پذیر ہوتا ہے، پھر اس میں برگ وبار آتے ہیں اور پھر وہ ایک تناور درخت کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ عبدالصمد نے کمال فن کاری سے ایسے چھوٹے چھوٹے واقعات کو زیب داستان بنایا ہے جن کی حیثیت بعد میں ناگزیر بن کر ابھرتی ہے اور جو ناول کے بنیادی ڈھانچے کو مضبوط بناتے ہوئے اسے تکمیل تک پہنچاتے ہیں مثلاً اصغر حسین اور اختر حسین کی سرد جنگ، اصغر حسین کا بہار شریف آنا جانا، اسلام پور سے پٹنہ تک کا سفر، متعلقین کے ساتھ گفت وشنید، مسلم لیگ کا الیکشن، نواکھالی کا فساد اور قتل وغارت گری کے واقعات وغیرہ۔ یہ سب چھوٹے چھوٹے واقعے ہیں مگر ایک بڑے مقصد کا جزو بن جاتے ہیں یعنی اس وقت کے مسلمانوں کی نفسیاتی اور جذباتی کیفیتوں کا احاطہ کرنا۔ یہ مقصد بحسن وخوبی پورا ہوتا ہے کیونکہ حصول آزادی کے آخری چند سالوں سے قیام بنگلہ دیش تک بہاری مسلمان جتنے المیہ موڑوں سے گزرے ہیں ان کی ایسی کوئی تاریخ ''دوگز زمین'' کے سوا نہیں ملتی جس میں عوامی سطح پر جز جز معلومات فراہم کر دی گئی ہو اور جس میں مسلمانوں کی نفسیاتی و جذباتی کیفیتوں کی زندہ تصویریں محفوظ ہوگئی ہوں۔ بقول ڈاکٹر اعجاز علی ارشد اس ناول کی ایک اہم خصوصیت یہ بھی ہے کہ

> ''مہاجرین کے مختلف ذہنی رویوں کی عکاسی جس طرح اس ناول
> میں کی گئی ہے وہ ناول نگار کی حقیقت پسندی اور فنی مہارت دونوں کا
> ثبوت ہے''

دوگز زمین فارم اور بیانیہ کے لحاظ سے ایک گٹھا ہوا ناول ہے جس کی کوئی چول ڈھیلی نہیں۔ واقعات سے واقعات ابھرتے ہیں اور

تاریخی حقائق کے سیاق وسباق میں ناول کا قوام بنتے جاتے ہیں۔ ناول کا اختتام ایک طویل مکتوب کی صورت میں تھوڑی دیر کے لئے عجیب محسوس ہوتا ہے۔ مگر بقول پروفیسر وہاب اشرفی حزنیہ کی تعمیر میں اس خط کا بھی ایک رول ہے جسے فراموش نہیں کرنا چاہئے۔

''دوگز زمین'' کا اسلوب شاعرانہ کیف وکم سے بالکل خالی اور سادہ وسلیس ہے۔ کیونکہ عبدالصمد بناوٹی سجی سجائی یا شعری زبان کو فکشن کیلئے سم قاتل سمجھتے ہیں۔ انہوں نے ایک انٹرویو میں فرمایا کہ

''فکشن کی زبان نہ صرف یہ کہ Ornamental نہیں ہونی
چاہئے بلکہ اس میں ایک خاص قسم کا کھردراپن ہونا چاہئے جیسے
بیدی کے یہاں جیسے منٹو کے یہاں _____ جہاں تک آپ
اپنی زبان سے کچھ کہنا چاہتے ہیں ہاں تک آپ شعری زبان کا
استعمال کر لیجئے لیکن آپ کی زبان سے جب دوسروں کی بات
ہونے لگتی ہے تو اسکے لئے کون سی زبان استعمال کریں گے آپ؟
فکشن نگار دراصل ایک ایسا فوٹو گرافر ہوتا ہے جو تصویریں اتارتا
جاتا ہے اور اپنی کمنٹری کچھ نہیں دینا۔ لیکن تصویروں کا تراویہ کچھ ایسا
کر دیتا ہے کہ کہانی آپ تک پہنچنے کے لئے بے تاب ہو جاتی ہے۔
اس Process میں جو زبان استعمال ہوتی ہے وہ غیر فطری نہیں ہو سکتی۔ اگر ہوتی ہے تو یہ اس فکشن کے آرٹ کا
کھوٹ ہے۔''

عبدالصمد بنیادی طور پر شفاف اور سادہ بیانیہ کے حامی ہیں۔ یہ وہ بیانیہ ہے جو پریم چند کے ''گئودان'' یا حیات اللہ انصاری کے ''لہو کے پھول'' کی روایت کو آگے بڑھاتا ہے۔ یعنی مذکورہ ناول نگاروں کی سادگی کو پرکاری میں تبدیل کرتے ہوئے وہ استعارے، تمثیل یا علامت کا ہلکا ہلکا سایہ اپنے بیانیے پر ڈالتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ وہ غیاث احمد گدی اور کلام حیدری کی نثر سے بھی متاثر ہیں اور غیر شعوری طور پر ان کا اثر قبول کر لیتے ہیں۔ حسین الحق نے ان کے افسانوں اسلوب پر گفتگو کرتے ہوئے شاید اسی طرف اشارہ کیا ہے کہ

''عبدالصمد کا اسلوب اس لحاظ سے قابل توجہ ہے کہ شفاف
بیانیہ ہونے کے باوجود ان کے یہاں لکا چھپی کا کھیل لگا تار
جاری رہتا ہے۔ عبدالصمد بات کہتے ہیں مگر کھل کر نہیں
کہتے۔'' (شعر وحکمت دور سوم کتاب ۷ ص ۴۲۵)

''دوگز زمین'' کے اسلوب کی مثال ایک ہموار اور پرسکون ندی سے دی جا سکتی ہے جس میں روانی اور سکون زیادہ ہے مد وجزر کی کیفیت کم کم اور ٹھہر ٹھہر کر۔ اس میں شاعری کے لوازمات کا بوجھ زبردستی نہیں ڈالا گیا بلکہ چھوٹے چھوٹے جملوں میں ترسیل مفہوم کا مشکل کام آسانی سے

انجام دیا گیا ہے۔

''عبدالصمد'' زبان کو تصنع اور بناوٹ سے یکسر پاک رکھتے ہیں اس لئے ان کا اسلوب بیان سادہ اور سلیس ہے۔ علامتوں، استعاروں اور تمثالوں سے کام لیتے ہیں مگر اسی قدر کہ ان سے بیانیہ میں تاثیر پیدا ہو نہ کہ پیچیدگی اور ابہام۔ فقرے زیادہ طویل نہیں ہوتے۔ ان میں سادگی اور تسلسل بدرجۂ اتم ہوتا ہے جو قاری کو بڑی سہولیت کے ساتھ اپنے ساتھ ساتھ لے کر آگے بڑھتا رہتا ہے۔

''ہوا کچھ نہیں تھا پولیس شرمندہ ہو کر یہاں سے گئی تھی لیکن گھر کا وہ
حصہ جس میں کچھ بھی پوشیدہ نہیں تھا ایک بھرم کے سوا، سو وہ بھی
طشت از بام ہو گیا تھا۔ کوئی ایسی چیز باقی نہیں بچی تھی جس پر کج
کلاہی برقرار رکھی جا سکتی۔ تلاشی لینے والے جا چکے، پرسہ دینے
والے بھی اپنے گھروں کو سدھارے لیکن اختر حسین کو ایسا لگ رہا
تھا جیسے بین ہاؤس کی پھیلی ہوئی اور شیخ الطاف حسین کے زمانے
سے کھڑی دیواروں میں ہزاروں لاکھوں چھید ہو گئے ہوں۔ اور
ہر چھید سے ایک ایک آنکھ لگی اندر جھانک رہی ہو، کوئی دم ہو گا
جب چھیدوں سے جھانکتی ہوئی آنکھیں اندر آ جائیں گی، پھر سب
کچھ ختم ہو جائے گا، برسوں کی جمی جمائی ساکھ قربانیوں سے لبریز
عزت اور وطن دوستی میں معمور دل''

''سندھی بہاری کو اس طرح گھور گھور کر دیکھتا کہ جو بہاری بنگلہ دیش
دیکھ کر آیا تھا وہ تو یوں سہم جاتا جیسے بلّی کو دیکھ کر چوہا۔ کراچی میں ہر
بہاری پچھلے کئی سالوں سے کسی بڑے واقعہ کا منتظر ہے بس ایک
چنگاری دکھانے کی دیر ہے ورنہ لاوا اندر اندر پک چکا ہے۔ آپ
یقین مانئے ابا جان کہ اگر خدانخواستہ بہاری اور سندھی میں کبھی ٹھن گئی
تو یہ کوئی معمولی واقعہ نہ ہو گا اس کی حیثیت تواریخی ہو گی۔ خدا کا شکر ہے کہ شاہ نعمت اللہ کی پیشین گوئی میں ایسی کوئی
بات نہیں ورنہ
یہاں بہاری اتنے آرام سے پیر نہیں پسارتے''

عبدالصمد کے اسلوب کا ایک بڑا طاقتور عنصر ''طنز'' ہے۔ وہ بڑے سادہ اور سلیس جملے لکھتے ہیں مگر اس میں ایسا طنزیہ پہلو سما دیتے ہیں کہ وہ

بات قاری کے ذہن کے کسی نہ کسی گوشے میں جا کر چبھ جاتی ہے۔ سادگی سے پُر ان طنزیہ عبارتوں میں بلا کی کاٹ ہوتی ہے۔ مثلاً یہ جملے ملاحظہ کریں

''خدا کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے جناح صاحب کو کہ اردو کا
ایک لفظ بھی نہیں جانتے تھے سوائے ''پاکستان'' کے لیکن پاکستان
کی زبان اردو بنادی''

''اس وقت تک جلسوں میں ٹرکوں سے آدمی خرید کر لانے کا رواج
پیدا نہیں ہوا تھا''

''میں تو برابر خط لکھتا ہوں اگر ڈاک نے مہربانی نہیں کی ہوگی تو یقیناً
ملے ہوں گے''

''حامد کو انہوں نے قریب بلا کر آہستہ سے پوچھا'' پاکستان سے
آئے ہو''؟

''جی ہاں''..... ''ماموں کو نہیں لائے؟''

جی وہ تو مغربی پاکستان میں ہیں میں مشرقی سے آیا ہوں''

''کتنے پاکستان ہیں بابو؟'' حامد سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔ سب
لوگ خاموش تھے''

''اماں یہاں مسلمان پریشان ہوتا ہے تو کتنے مزے میں پاکستان
چلا جاتا ہے وہاں اُسے نوکری بھی مل جاتی ہے اور گھر بھی''

''بیٹا پھر تم کو کیوں نہیں ملی نوکری، تم تو وہاں جج بننے کے لئے گئے تھے''

سرور حسین کے چہرے پر دھواں سا پھیل گیا''

عبدالصمد اپنے اسلوب کو سجانے سنوارنے کی شعوری کوشش نہیں کرتے۔ اپنی عبارتیں روانی سے لکھتے جاتے ہیں صنائع، بدائع یا پرتکلف اسلوب کے دیگر عناصر خود بخود جا بجا شامل ہو جاتے ہیں۔ اس لئے ان کی نثر میں ہمیں تشبیہات و استعارات بھی ملتے ہیں اور ضرب الامثال و محاورے بھی۔ کہیں علامتوں سے بھی کام لیا گیا ہے اور کہیں اشاروں اور کنایوں سے بھی۔ مگر کہیں بھی یہ احساس نہیں ہو پاتا ہے کہ ان عناصر کو زبردستی اسلوب کا حصہ بنایا گیا ہے۔ دراصل عبدالصمد کے انداز اظہار میں وہ شگفتگی اور شیفتگی ہے جو دلنشیں اور دلکش نثر کے عناصر سے خالی رہ ہی نہیں سکتی۔ مثلاً ان اقتباسات پر ایک نظر ڈالیں۔

''وہ وہیں پر رہ گئے تھے جہاں تھے البتہ یہ ضرور ہوا کہ ان کو اپنے

مقصد کے لئے استعمال کرنے والے دماغ ان کو چھوڑ کر جا چکے
تھے۔ پوری کی پوری گاڑی پٹڑی پر کھڑی تھی لیکن انجن اس سے
الگ ہو کر کہیں گم ہو چکا تھا''

''پانی کے اندر ایک لہر چل رہی تھی اوپر سے پانی پر سکون تھا اور
بھولے بھالے لوگ اسی سکون سے بہت خوش تھے''

''ہم لوگ سیاست کی دیوی کے پجاری ہیں کسی مندر کے نہیں اور
سیاست کی دیوی رات اور دن مسکراتی رہتی ہے''

''تین روز یوں گزر گئے جیسے منٹوں پر سوار تھے اور منٹوں کو بھی
پر لگے تھے''

''وہ ناچنے لگتی تو ایسا لگتا کہ اس کے جسم میں کوئی جادو ہے جو سر چڑھ
کے بول رہا ہے''

''ابھی اس نے پڑھائی شروع کی ہی تھی کہ ہونہار بروا کے چکنے
چکنے پات دکھائی دینے لگے تھے''

''سیاست اب کوئلے کی ایسی کان بن گئی ہے جس کے اندر جانے
والوں کو کالک ضرور لگے گی''

''وہ تلچھٹ کی طرح خود ہی کنارے آ لگے تھے انہیں کسی نے دودھ
کی مکھی کی طرح نکال نہیں پھینکا تھا''

''ملک تقسیم ہوتے ہوتے تین حصوں میں بٹ گیا لیکن ہمارا
خاندان تین تیرہ نو اٹھارہ ہو گیا''

''وہاں تو حالت یہ ہے کہ اندھے کی گائے بیانی ہے اور لوگ چُکّا
لے کر دوڑ رہے ہیں جس کے ہاتھ جو لگ رہا ہے وہ ہتھیا رہا ہے''

''لیکن ہوتا یہ ہے کہ کمبل تو میں نے چھوڑ دیا ہے کمبل مجھے نہیں
چھوڑتا''

عبدالصمد کو پیکر تراشی کا ہنر بھی معلوم ہے۔ وہ غیر محسوس اشیاء تک کی پیکر تراشی کر ڈالتے ہیں اور وہ بھی اس طرح کہ پڑھنے والے کو محسوس معلوم ہوں۔ جیسے یہ جملے دیکھئے

''بس میں خاموشی طاری تھی لیکن یہ خاموشی کراہتی ہوئی سی لگ
رہی تھی اختر حسین جیسے خاموش طبع انسان کو بھی یہ کراہ کان کے
پردے پھاڑنے کے برابر محسوس ہو رہی تھی''

''وہ بار بار خط کو پڑھ کے اس خوشی کو اپنے ہاتھوں سے چھونا چاہتا تھا
جو اچانک اس کی جھولی میں آ گرا تھا''

عبدالصمد کا اسلوب یوں تو پورے ناول میں سادہ سلیس اور بیانیہ ہے مگر کئی جگہ جذبات میں کھو کر یا واقعے کی مناسبت سے وہ شاعرانہ اور فلسفیانہ نثر بھی لکھ گئے ہیں جو کرشن چندر اور احمد ندیم قاسمی کے اسلوب کا حصہ ہے اور قرۃ العین حیدر کی منطقی اور استدلالی گفتگو میں ملتی ہے۔ شاید کرشن چندر اور قرۃ العین حیدر کے اسالیب کے امتزاج سے عبدالصمد نے اپنا یہ منفرد رنگ پیدا کیا ہے۔ اس رنگ سے ان کے اسلوب میں ایک خاص متانت وقار اور شیرینی پیدا ہو جاتی ہے اور ہمیں عبدالصمد کو بار بار پڑھنے پر مجبور کرتی ہے۔

''تاروں پر جب اس نے اپنی مانوس انگلیاں پھیریں تو ارتعاش کی
ہلکی ہلکی سی صدائیں بلند ہوئیں، ان میں الفاظ نہیں تھے۔ شاید
الفاظ پگھل کر راگ بن گئے تھے۔ راگ کی زبان الفاظ کی محتاج
نہیں ہوتی۔ کون کس کا محتاج ہوتا ہے اور کس کا نہیں ہوتا لیکن سب
ایک خدائی کے محتاج ہوتے ہیں اور اسے محسوس کرنے
والے.....وقت.....اونچائی سے بہتا ہوا
وقت.....کتنی چٹانوں پر سر پٹکتا ہوا، کتنی چٹانوں کو توڑتا
ہوا.....جھاگ اڑاتا ہے۔ اے وقت! کہیں پر تو
ٹھہر!''

''ابا کی ساری زندگی ہندوستان کی سیاسی تاریخ کا ایک مکمل باب
ہے جو وطن دوستی کے دعووں کی ضخیم کتابوں پر سلگتی ہوئی ٹکیہ کی طرح
رکھا ہوا ہے''

''وطن سے محبت کرنا ایمان کا ایک جز ہے اور وطن کے لئے
کڑھنا عین عبادت''

''دو گز زمین'' سے پتہ چلتا ہے کہ عبدالصمد کا مطالعہ بہت وسیع ہے اور انہیں زبان و بیان پر بھی قدرت حاصل ہے۔ انہوں نے مشاہیر ادب کے ساتھ ساتھ زندگی کا، سماج کا گہرا مطالعہ کیا ہے' ان کے مشاہدات باریک اور عمیق ہیں۔ اسی لئے اپنی کہانی کو تجربات و مشاہدات

کے ذریعہ انہوں نے وہ حقیقی رنگ دے دیا ہے کہ اس پر تخیل کی کارفرمائی کا شبہ بھی نہیں ہو پاتا۔ اس میں ان کے مخصوص اسلوب کی شگفتگی اور سلاست کا بھی بڑا اہم رول رہا ہے۔

عبدالصمد کا دوسرا ناول ''مہاتما'' موجودہ تعلیمی نظام کی بگڑتی ہوئی صورت حال کا احاطہ کرتا ہے۔ بہار میں اعلیٰ تعلیم اقتدار پرستوں اور تجارتی ذہن رکھنے والوں کے ہاتھ کا کھلونا بن گئی ہے، اس صورت حال کا ذمے دار کون ہے؟ سیاست داں، والدین یا خود اساتذہ؟ ناول اس تشویشناک صورت حال کا کوئی حل پیش نہیں کرتا بلکہ اسکی بھرپور ترجمانی کرتا ہے اور مسئلہ کی شدت کا احساس دلاتا ذہنوں پر ایک بڑا سوالیہ نشان ثبت کرتا ہے۔ ناول کا عنوان ''مہاتما'' بے ایمان ضمیر فروش، گھناؤنے کردار کے حامل اساتذہ کے لئے طنز کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔

''خوابوں کا سویرا' بہار کے شہر گیا کے ایک زمیندار کنبے کے عروج وزوال کی سرگذشت ہے۔ اس میں دو بھائیوں کی جوڑی ہے منّا لال اور پنّا لال۔ ان میں منا لال سیکولر اور پنا لال فرقہ پرست ہے۔ مصنف نے ناول میں سیاست اور خاص طور سے تقسیم ہند اور اس کے بعد کی سیاست کا بڑا گہرا اور تفصیلی جائزہ پیش کیا ہے۔ اس عہد کے نوجوانوں کی زندگی کے نشیب وفراز اور پیچیدگیاں، تعلیمی گراوٹ ملازمتوں میں رشوت خوری اور مذہبی فسادات اور مغربی ومشرقی تہذیبوں کا ٹکراؤ جیسی بہت ساری باتوں کو بھی ملا کر ناول کا تانا بانا تیار کیا گیا ہے۔

عبدالصمد کے تیسرے ناول ''مہاساگر'' کا موضوع موجودہ ہندوستان میں پنپنے والی وہ نفرت وعداوت ہے جس کی جڑیں ماضی میں پیوست ہیں۔ مصنف نے بڑی چابکدستی سے بڑھتی ہوئی فرقہ وارانہ ذہنیت اور نوجوان نسل کے دماغوں میں سرایت ہوتے ہوئے زہر کی تصویر کشی کی ہے۔ ناول میں سیکولر سوجھ بوجھ اور سلجھے ہوئے ذہن کے افراد بھی ہیں جن میں نوجوان رمیش کے علاوہ گزرتی ہوئی نسل کے ویاس جی، منشی اللہ دین اور پروفیسر یادو ہیں لیکن لمحۂ فکریہ یہ ہے کہ گزرتی ہوئی نسل کے افراد آخر کب تک رہیں گے؟.....

''دھمک'' عبدالصمد کا قابل ذکر ناول ہے اور ان کے فن کا نیا نشان قائم کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اس میں سیاسی بساط پر مہروں کی طرح رقص کرنے والے کرداروں کے ذریعہ ''بہار'' کے سیاسی کھیل، کرپشن اور شرمناک سرگرمیوں کے مختلف رنگوں کو کئی زاویوں سے پوری فن کاری کے ساتھ اجاگر کیا گیا ہے۔ ناول کا آغاز مرکزی کردار راجو کے انقلابی حوصلوں اور جوش میں نکلے اس کے بے ربط جملوں سے ہوتا ہے جو گاؤں کی سات دلت لڑکیوں کی اجتماعی عصمت دری پر انتقام کی آگ میں جل رہا ہے اور اسی تپش میں منتری کے چہرے پر کالکھ پوت دیتا ہے۔ یہیں سے سیاست کا کھیل شروع ہوتا ہے اور ایک جوشیلا انقلابی نوجوان سیاسی چالوں اور مہروں کا شکار ہو کر اس تالاب کی مچھلی بن جاتا ہے جہاں کا سارا پانی گندا ہے اور جس پر سیاسی مگرمچھوں کا قبضہ ہے۔ فنی اعتبار سے یہ ناول کئی خوبیوں کا مالک ہے۔ کردار نگاری، مکالمے، فکر واظہار اور واقعات کا ربط وتسلسل ایسے کئی خصائص ہیں جو متوجہ کرتے ہیں۔ ایک بات اور اہم ہے کہ عبدالصمد کے تمام ناول ایک تخصیص لئے ہوئے پس منظر کے حامل ہوتے ہیں۔ تقسیم ہند، ترک وطن، فسادات، متوسط طبقہ کے معاملات ومسائل، ان کی معیشت، بدحالی، پسماندگی، تعلیمی پسماندگی، خود اعتمادی کا فقدان، عام مایوسی، خوف وہراس اور جدوجہد سے پُر زندگی۔ مگر ''دھمک''

ان کے تمام ناولوں سے الگ ہے اور اس کا پس منظر سیاست اور سیاسی بدعنوانیوں میں گھرا ہوا سماج ہے۔ عبدالصمد نے اپنے صوبے کے سیاسی گلیاروں اور اس کے شب و روز کو جھانک جھانک کر دیکھا ہے اور اس کے اندھیروں اجالوں کو بڑی سادگی و بے تکلفی سے سلیس شفاف اسلوب میں پڑھنے والوں تک پہنچا دیا ہے۔

عبدالصمد اپنے ناولوں میں آرائشی اور Polished زبان سے احتراز کرتے ہیں اس لئے ان کے ہر ناول کا اسلوب سادہ اور عوامی ہے اگر ان کے ناولوں سے عوامیت لے لی جائے تو موضوع پسر جائے گا۔ عہد جدید کے سلگتے ہوئے کھردرے موضوعات ہوں تو مفرس و معرب اور قلعی دار زبان و اسلوب کی تلاش سستی جمالیاتی حس پر دال ہوگی۔ عبدالصمد ان کھردرے موضوعات کو نبھانے کے لئے زیادہ Committed دکھائی دیتے ہیں اس لئے جذبات و احسات کو کسی ایہام و علامت یا تمثیل و استعارے کی چادر نہیں دیتے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ان کے تمام ناول اسلوب کے اعتبار سے یکساں ہوگئے ہیں اور دوگز زمین'' کی طرح ہی سادگی سلاست اور صفائی کی خصوصیات رکھتے ہیں۔

عبدالصمد کے اسلوب کی طرح ان کے ناولوں کے بعض واقعات اور موضوعات میں بھی یکسانیت پائی جاتی ہے۔ تکرار اور یکسانیت کی یہ کیفیت انہیں ''دوگز زمین'' سے آگے بڑھنے میں رکاوٹ پیدا کر رہی تھی کیونکہ ''دوگز زمین'' کے بعد ان کا جو فکری اور اسلوبی بہاؤ دھیمے انداز میں بہت اطمینان سے آگے بڑھنا تھا مہاسا گر اور دھمک تک آتے آتے اس میں ایک قسم کا ٹھہراؤ پیدا ہو گیا۔ شاید اس کی وجہ ان کا یہ خیال ہو کہ وہ اپنی صلاحیتوں کا بہترین اظہار ''دوگز زمن'' میں ہی کر چکے اب آگے بڑھنا ممکن نہیں۔ یا شاید وہ کسی ذہنی Fixation کے شکار ہو چکے تھے ایسے میں انہیں ممتاز ناقد پروفیسر وہاب اشرفی نے مشورہ دیا کہ

> ''عبدالصمد کو ناول نگار کی حیثیت سے Survive کرنا ہے اور ''دوگز زمین'' سے آگے نکلنا ہے تو انہیں دوسری راہ اختیار کرنی پڑے گی۔ سیاسیات نہیں۔ معاشیات نہیں۔ Sociology ہیں Sexology۔ جی ہاں! اب انہیں Sexology پر لکھنا پڑے گا، سیکس پر، یہ ضروری ہے'' (نقاد پٹنہ یکم تا ۱۵/ اکتوبر ۲۰۰۵ء)

یعنی موضوع کی تبدیلی ہی ان کی فکر اور اسلوب میں ندرت پیدا کرے گی اور ان کیلئے آگے کے راستے ہموار ہو سکیں گے۔ عبدالصمد پر اس مشورے کا بڑا اثر ہوا اور انہوں نے دو ناول اسلوب اور موضوع کی ندرت کے ساتھ پیش کیا۔ چونکہ عبدالصمد کے تمام ناول ایک تخصیص لیے ہوئے پس منظر اور اسلوب کے حامل ہوتے ہیں اس لیے 'بکھرے اوراق' اور 'شکست کی آواز' نے قارئین کو اسلوب اور موضوع کی ندرت کی وجہ سے حیران کر دیا۔ 'بکھرے اوراق' موضوع کے اعتبار سے تو وہی سیاسی اور معاشرتی کرپشن پیش کرتا ہے جس کے لیے عبدالصمد مشہور ہیں۔ اس میں بھی انہوں نے خوف و دہشت کے موجودہ ماحول کو ہمہ جہت رنگ میں دیکھنے دکھانے کی کوشش کی ہے مگر یہاں ان کا اسلوب استعاراتی اور علامتی ہے۔ عبدالصمد شروع میں اپنے استعاراتی اور علامتی افسانوں کے لیے خاصے مشہور رہے ہیں مگر ناول میں انہوں نے یہ انداز پہلی مرتبہ اختیار کیا ہے۔ یہ اسلوب ناول میں بہت کامیاب تو نہیں ہو سکا مگر اس کے ذریعہ انہوں نے ناول کو ہماری موجودہ زندگی کا آئینہ خانہ بنانے میں کامیابی ضرور حاصل کی ہے۔ 'شکست کی آواز' اسلوب کے بجائے موضوع کے سبب

حیران کرتا ہے کہ اس میں عبدالصمد پہلی بار سیاسی اور سماجی گلیاروں سے نکل کر انسان کے نفسیاتی اور جنسی مطالعے کی طرف متوجہ ہوئے ہیں۔انہوں نے ندیم نام کے ایک Introvert نوجوان کی شخصیت میں پوشیدہ جنسی شعور کی پیچیدگیوں کو وقوعوں کے ذریعہ تدریجی طور پر کامیابی سے دکھایا ہے۔ندیم چونکہ فطری طور پر دروں بیں(Introvert) ہے، وہ لڑکیوں سے گھبراتا ہے۔طبعیاتی تقاضے کے تحت جنسی جذبے کی فزوں تری ندیم کی شخصیت میں ایک کشاکش پیدا کرتی ہے۔وہ نوری کو نیم عریاں انداز میں دیکھتا بھی ہے مگر جب وہ اپنا جسم دکھانے لگتی ہے تو گھبرا بھی جاتا ہے۔ناظمہ قریب آنے لگتی ہے تو خود فاصلہ قائم کر لیتا ہے۔مگر یہی جذبہ اس وقت بیبا کی محسوس کرتا ہے جب وہ نوری کو ماسٹر کے کمرے سے نکلتے ہوئے دیکھ لیتا ہے۔جب یہ باندھ ٹوٹتا ہے تو وہ اپنے اندر ہمت بٹور لیتا ہے کہ عورت کو مختلف روپ میں دیکھ سکے۔اختری کا آنا، بچے کو دودھ پلانا، پھر غسل خانہ میں نہانا، یہ ساری تصویریں ندیم کی شخصیت میں پوشیدہ برف کی سِل کو پگھلاتے رہتی ہیں اور تصورات اور حقیقت کا ٹکراؤ اُسے آگہی کی نئے جہتوں سے آشنا کرتا ہے۔عبدالصمد نے ندیم کی آہستہ خرام تبدیلیوں کو متعدد چھوٹے چھوٹے خارجی واقعات کے ذریعہ فطری انداز میں پیش کیا ہے۔شخصیت اور اس کی دروں بینی کی نفسیات کا گہرا مطالعہ اِس ناول کا اہم ترین وصف ہے جو عبدالصمد کی ناول نگاری کی ایک نئی مگر دلچسپ جہت سے روشناس کراتا ہے۔

عبدالصمد کے ان تمام ناولوں کے مطالعے سے ایک بات تو واضح ہو جاتی ہے کہ انہوں نے بیسویں صدی کے اواخر میں اردو ناول کی طرف جو پیش قدمی کی تھی وہ اکیسویں صدی میں بھی قائم رہی ہے۔نئی صدی میں وہ ناول کی طرف زیادہ سنجیدگی سے متوجہ ہوئے ہیں اس لیے توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ ہمیں کوئی بڑا اور تاریخی اہمیت کا ناول بہت جلد دیں گے جو دوگز زمین کے بعد ان کے سفر کا نیا اور نسبتاً زیادہ نمایاں نشان ثابت ہوگا۔